

پنجابی شاعری میں مظاہر فطرت: شعور و آگہی کا ایک بڑا حوالہ

(اشجار و نباتات کے حوالے سے)

ڈاکٹر نبیلہ رحمان

چیرپرسن شعبہ پنجابی

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

NATURAL PHENOMENA AND PUNJABI VERSE

Nabeela Rahman, PhD

Chairperson Department of Punjabi

University of the University, Lahore

Abstract

Natural phenomena have significant value in Punjabi poetry, both classical and modern. Trees, plants, shrubs and crops are used as references to enlighten the world; from body to soul. Trees are associated with almost every aspect of human life. This article briefly elaborates countless aspects and meanings related to the greenery of this world used in Punjabi classical folk tales and modern poetry. Local trees, crops and shrubs used as symbols by the Punjabi poets have also been discussed. The article not only focuses Punjabi literary eco-criticism but also explains the relationship of a Punjabi with nature.

Keywords:

پنجابی زبان و ادب، شاعری، مظاہر فطرت، اشجار، نباتات، خواجہ غلام فرید،

میاں محمد بخش، امرتا پریتم، مولوی غلام رسول

یہ حقیقت ہے کہ خارجی ماحول اور فضا نہ صرف ہماری بصارت پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان مناظر کے اثرات ہمارے ذوق کو بھی نکھارتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر ہماری فکر و بصیرت کو روشن کرتے ہیں اور شعرو سخن کی بہت سی جہات سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ پنجاب (پنج + آب) جو کبھی ست آب تھا، کا جغرافیائی حدود اربعہ یوں تو مختلف زمانوں میں بدلتا رہا، لیکن یہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آنکھ کا جس سے ربط ہوتا ہے، دل اُسی کے تاروں میں بندھتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس تعلق کی تہیں مفاہیم کی سطح سے بیان و بدیع کے بحر میں اُتر جاتی ہیں اور اس کی سرسبز و شادابی، الفاظ و خیال کی تازگی اور تطہیر کا خوش گن احساس بھی دلاتی ہیں۔ پنجابی لوگ گیتوں میں باغوں، بیلوں، درختوں، جنگلوں، کھیتوں، کھلیانوں غرض پورے زرعی ماحول کا احوال تو اظہر من الشمس ہے لیکن ادبیات عالیہ میں ان مظاہر فطرت کی کثیر صورتی فضا اور مزاج اپنے انداز میں کسی قدر دلچسپ و دل نشیں ہے وہ یہاں مختصراً پیش خدمت ہے۔

مثال کے طور پر پنجابی کی متصوفانہ ادبی روایت کے بانی بابا فرید گنج شکر کے کلام میں جہاں سماجی و ثقافتی عناصر کی فراوانی ہے وہیں جغرافیائی ماحول اور موسموں کے حوالے سے بھی اُن کی شاعری میں کئی فکری بیانیے موجود ہیں جن میں وہ اشجار و نباتات کے اذکار و امثال سے خود شناسی و خود آگہی ایسی تعلیمات دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک اشلوک ہے جس میں وہ بزرگوں اور درویشوں کی صحبت اختیار کرنے اُن کی خدمت گزاری کے ذریعے احکام الہیہ سے جُڑنے کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں:

صاحب دی کر چا کری دل دی راہ بھرانہ

درویشاں نوں لوڑھیے رُکھاں دی جیراند (۱)

یعنی اپنے رب کی خدمت و عبادت انجام دے اور اپنے دل کا بوجھ اتار دے (اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت سے اطمینان قلب کا سامان کر لے، درویشوں اور اللہ والوں کو تو درختوں کے سے حوصلے اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے) درخت سایہ دیتے ہیں، پھل دیتے ہیں، لوگ انھیں پتھر مارتے ہیں اور ان کی شاخیں کاٹتے ہیں مگر یہ پھر بھی کسی کو اپنے پھل اور سایہ سے محروم نہیں کرتے، فقیر اور درویش کے لیے بھی حوصلہ اور صبر و تحمل درکار ہے۔

یوں وہ بزرگ ہستیوں کے وجود کو درختوں کی صفات سے مشابہ کرتے ہیں اور ان درختوں، پودوں، جڑی بوٹیوں اور گھاس کے ذکر کے ذریعے وجود الہی سے تعلق جوڑنے کے ساتھ ساتھ خود آگہی، صبر و استقامت، جبر کے خلاف آواز اُٹھانے کا اعتماد اور شعور بھی دیتے ہیں:

گُلوک فریدا گُلوک جیوں راکھا جوار

جب لگ ٹانڈا نہ گرے، تب لگ گُلوک پُکار (۲)

یعنی بولو! آواز بلند کرو (کوک شور۔ اونچی آواز۔ چیخ۔ زور سے آواز لگانا) جیسے جوار کی فصل کی حفاظت کرنے والا آواز بلند کرتا ہے تاکہ چرند پرند اُس کی فصل خراب نہ کریں۔ اسی طرح تم بھی اپنی زندگی کی حفاظت کرو، بولو، ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤ تاکہ کوئی ظالم تمہارا حق غصب نہ کرے۔ زندگی کے ختم ہونے تک اپنی آواز بلند کرتے رہو۔

کندھی اُتے رُکھڑا کچرک بنھے دھیر
کچے بھانڈے رکھیے کچرک تائیں نیر (۳)

یعنی دریا کے کنارے پر جو چھوٹا سا درخت ہے وہ کتنی دیر تک ہمت باندھے اور پانی کا مقابلہ کرے؟ (وہ تو کٹاؤ سے جائے گا) اسی طرح مٹی کے کچے برتن پانی میں کب تک رکھ سکتے ہیں؟ (یہی حال اس دُنیا کا اور اس میں انسان کی زندگی کا ہے، مٹی کا بت، کچے دھاگے کی طرح سانس ہیں۔ کس قدر بے ثبات اور عارضی زندگی ہے!!؟) ایک اور جگہ میں فرماتے ہیں:

تھیو پواہی دبھ ، جے سائیں لوڑیں سبھ
اک چھجے، بیا لتاڑیئے، تاں سائیں دے درواڑیئے (۴)

یعنی اگر تجھے اپنے رب تک مکمل رسائی درکار ہے تو پھر رستہ میں بچھنے والی دبھ (دوب) نامی گھاس بن جا، جو ایک تو نرم پڑتی ہے (ڈھیلی ہو کر پھیلتی ہے) دوسرے اسے پاؤں سے روندنا جاتا ہے تب جا کر اللہ تعالیٰ کے آستانے یعنی مسجد میں لے جا کر بچھانے کے قابل ہوتی ہے (یہ تواضع سے نرم پڑنے اور اللہ تعالیٰ کے حضور قبولیت پانے کی مثال ہے۔

اپنے ایک مشہور شلوک میں وہ جنگل اور بیلوں میں رب کے ڈھونڈنے کی ایک مقامی روایت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

جنگل جنگل کیا بھویں، وَن کنڈا موڑیں
وَسی رب ہیا لینے جنگل کیا ڈھونڈیں (۵)

یعنی تو ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں کیا گھومتا پھرتا ہے اور جنگل کے کانٹے روندنا پھرتا ہے، رب تو تیرے پاس پاس ہے۔ تو اسے جنگل جنگل کیا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اللہ تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بابا فرید کے بعد پنجاب کا وسیبی، ثقافتی و سماجی نفسیات کا منظر نامہ سب سے زیادہ گروناک دیو کے کلام میں ملتا ہے۔

نانک گر سنتو کھ رُکھ دھرم، پھل پھل گیان
رس رسیا ہریا سدا پکے ، کرم دھیان
پت کے ساد کھادا لہے دانا کے سردان

سوئے کا برکھ پت پر والا پھل جوے ہر لال

تت پھل رتن لگے مکھ بھاکھت ہر دے ردے نہال (۶)

یعنی ناک گرو، استاد، مرشد، رہبر صبر و یقین کے مذہب کا ایسا درخت ہے، جس پر عرفان کے پھل اور پھول آتے ہیں کہ مرشد کے کرم اور دھیان سے اس کا پھل ہمیشہ رس سے بھرا رہتا ہے اور خالق کی عنایت سے اس کے پھل کا ذائقہ لذیذ رہتا ہے۔ سوئے کے درخت کے پتے مونگے سے ہرے اور پھل لعل و جواہرات جیسے ہوتے ہیں۔ پھر اُس کے منہ سے نکلا ہوا ہر کلمہ اور کلام دل و روح کو سکون، خوشی و شادمانی دیتا ہے۔

تسخیر ذات اور ذاتِ احد کی تلاش کے حوالے سے جنگل، بیلوں اور جزیروں کا تذکرہ ہمیں شاہ حسین، بکھے شاہ، میاں محمد بخش اور دیگر صوفیاء کے ہاں بھی مختلف پیرائے میں ملتا ہے۔ لیکن بحر و بر کے ان مظاہر کے مشاہدوں میں صوفیاء نے کائنات کے بھید تلاش کرنے کی سعی کی، اور ان مناظرِ قدرت اور نقوشِ فطرت کو انسانی باطن میں معکوس ذاتِ احد قرار دیا ہے، انسانی وجود جس کا مظہر ہے۔ یوں صوفیاء کے ہاں جنگل، بیلے اور باغات ایک طرف فہم ذات و کائنات کی کلید قرار پاتے ہیں تو دوسری طرف پودوں اور ان کے پھلوں کے حوالے سے وہ مقامی ثقافتی رنگوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ پیلو اور ڈیلھے (کریکا پھل) چولستان کے خاص میوے ہیں جو موسم بہار میں آتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کی ایک کافی ہے:

آچوں رل یار

آچوں رل یار پیلوں پکیاں نی وے
کئی بگڑیاں، کئی ساویاں، پیلیاں
کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں
کئی اودیاں، گنار
کئی رتیاں نی وے (۷)

بار تھئی ہے رشکِ ارم دی
سک سڑ گئی جڑھ ڈکھ تے غم دی
ہر جا باغ بہار
ساکھاں چکھیاں نی وے
پیلو پکیاں نی وے (۸)

یعنی آؤ دوست مل کر پیلو چٹیں۔ یہ کپکے ہوئے پیلو سفید، ہرے اور پیلے ہیں ان میں سے کئی بھورے اور ہلکے نیلے ہیں کئی دھیا اور کئی سُرخ رنگ کے ہیں۔

یعنی صحرا شکر ارم بن گیا ہے۔ دکھ درد کی جڑیں سُکھ گئی ہیں اب ہر جگہ باغ و بہار کا منظر ہے اے دوست؟ ہم تو یہ میوہ چکھ چکے ہیں!

بہار کی وجہ سے صحرا میں جال کے ہر چھوٹے بڑے درخت پر خوشحال انسانی آبادی کے منظر کا گماں ہوتا ہے جہاں سینکڑوں لوگ خوش و خرم ہیں، پیلو کھارہے ہیں، اور جنگل میں منگل منارہے ہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کلاسیکی صوفی شاعری کا ایسا نام ہیں جنہوں نے مناظر فطرت کی عکس نگاری اپنی کافیوں میں ایک مصوٰر کی طرح منظوم کی ہے۔ ایسا مصوٰر جو سالکِ حق کو ان ریگستانوں، نخلستانوں اور روہی رنگ رنیلیدی کے ذریعے منازلِ سلوک طے کرنے میں معاونت کرتا ہے بلکہ سالک کا رفیق اور رہبر معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ منظر آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے اور دل کی طمانیت کا باعث بنتا ہے تو دوسری طرف من میں ایک جوت بھی جگاتا ہے، جس کی روشنی سے من میں اُجالا ہوتا جاتا ہے اور یہ روشنی دائمی رہتی ہے۔ روہی کے خود رو کیکر، کریر اور شریہ نہ اپنے خوشبودار پھلوں، پھولوں اور خواص کے باعث شاعر کی تسکینِ قلب کا سبب بھی ہیں اور اُس کے من کی باطنی کیفیت کے نمائندہ بھی۔

فقیر قادر بخش بیدل کافی کے چوتھے کلاسیک شاعر ہیں۔ ان کے ہاں جہاں کافی اپنی مختلف ہیئتوں مثلاً گیت، غزل، مثلث، مربع اور مخمس میں ملتی ہے، وہیں وحدت الوجودی فکر کے بیان کے لیے پیاپی کی رنگارنگی بھی بھرپور ہے۔ اُن کی کافی ہے:

باغ بہاراں من نہیں بھاندے، باجھوں ویکھن یاراں وفی انفسکم ہر دے اندر، خوب کھلے گلزاراں
جوئی گل، گلزار بھی اوئی، سوئی بسنت بہاراں ویکھ تماشا وحدت والا، مست ہوئے ہوشیاراں
جس نے بُو بہار دی پائی، بھل گئے سبھ کاراں ہار سنگھار عجائب کیتا، رل مل گل رخساراں
قمری بلبل ویکھ تماشا، پل پل کرن پکاراں بیدل عشق دا لالہ وانگر، داغ دُتا دلداراں
گل شے ءِ ھُو ھو اللہ، ھو وچ ہزاراں

یعنی محبوب کی مہر بھری نظر پڑ جائے تو بہاروں اور باغوں کی رونق من کو بھاتی ہے۔ وفی انفسکم اُفلا تبصرون (سورۃ الذریت آیت 21) وہ تمہارے اندر ہے تو کیا تم اسے دیکھ نہیں پاتے۔ یعنی کائنات کے ہر نفس میں، ذات الہی کے حسن کی بہار کھلی ہے، جس میں پھولوں کے رنگ و بو کی صورت میں ایک گلزار ہے، جو دائمی ہے، ہمیشہ ہے مگر ذات الہی کی یہ قدیم و دائم نسبت وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اُسے پالیا ہے اور جو اس منزل تک پہنچا وہ کیسا ہی عقل و فہم والا ہو وہ فہم کے ان دریچوں سے ہی جب ذاتِ احد کے رنگوں کی نسبت اور شگھار دیکھتا اور محسوس کرتا ہے تو اس کے مجال میں مست ہو جاتا ہے۔ قمریاں اور بلبلِ قدرت کی اس صناعی پر اش اش کرتی ہیں۔ اے بیدل لالہ کے سُرخ پھول کی طرح محبوب حق کے عشق کا پھول میرے دل میں نشان بن گیا۔ ایسا نشان جس کے ذریعے میں تمام کائنات کے اجزاء میں صرف ذاتِ احد ہی کو دیکھتا ہوں۔ (۹)

شاہ حسین اور بلھے شاہ نے کپاس چُننے سے دھاگا بننے اور کاٹنے تک کے عمل کو ظاہری زندگی میں صالح اعمال کرنے سے یوں جوڑا ہے کہ انسان پر زندگی میں عمل و اخلاص، محنت و محبت اور موجود و وجود کی کئی پرتیں کھلتی ہیں۔ مثال کے طور پر بلھے شاہ کی ایک کافی ہے:

سب اکورنگ کیا ہیں دا / چوٹی، پینسی، کھدر دھوتر
لمل، خاسا، اکا سوتر / پونی وچوں باہر آوے
بھگوا بھیس گسائیں دا / سب اکورنگ کیا ہیں دا

یعنی چوٹی، چار سوتاروں والا کھدر، پینسی جس کے تانے میں پانچ سوتاریں ہوں یعنی پانچ سو تاروں والا کھدر، کم معیاری کھدر اور پتلا کپڑا، لمل جیسا باریک کپڑا، سب میں کپاس کا ایک ہی دھاگا استعمال ہوتا ہے اور اسی سے بھانت بھانت کے رنگوں کے کپڑے بنائے جاتے ہیں مگر ان کی اصل ایک ہے۔ (۱۰)

داستانوی ادب پر نگاہ ڈالیں تو ہر داستان میں قدرت کی صناعی کی مدح سرائی کے ساتھ علاقائی و جغرافیائی معلومات اور ماحول کی منظر کشی بھی خوب نظر آتی ہے۔ مثلاً داستان ہیر جس کا بیشتر حصہ پنجاب کے بیلوں، باروں اور اُس سے جوئے پر رونق ورنگین مناظر پر مشتمل ہے، بلا مبالغہ پنجاب کی دیہی زندگی کی تفسیر ہے نیز اس میں دیہاتی فطرتی ماحول کے ساتھ ساتھ باغ، نیلے اور بہار بطور فکری استعارہ بھی موجود ہیں اور قصے کا آغاز ہی وارث شاہ نے یوں کیا ہے:

حکم من کے سبناں پیاریاں دا قصہ عجب بہار دا جوڑیا اے
فقرہ جوڑ کے خوب درست کیتا، نواں پھل گلاب دا توڑیا اے (۱۱)

جبکہ ہاشم شاہ نے داستان سسی پنوں میں بالواسطہ و بلاواسطہ منظر نگاری کی ہے:

بہت عجائب سرو کھلوتے، باغ چو فیرو دیواراں فرش زمین زمرد آہا ثابت نقش نگاراں
نہراں حوض فوارے برسن، ہر ہر چوک بہاراں ہاشم شور جناور کردے، شور چکور ہزاراں
گھائل عشق کھڑے گل لالہ، نال لہو مکھ دھوتے سیب، انار، انگور بھرے رس، چنچ نہ لاون طوطے
قمری گوک کرے فریاداں، سرو آزاد کھلوتے ہاشم ویکھ بہار چمن دی، رُوح رہے وچ غوطے

یعنی دیواروں کے چاروں طرف نایاب سروایتادہ ہیں جبکہ باغ کا فرش زمرد کی طرح سبز اور صاف نظر آتا ہے جس میں حوض، فوارے اور نہریں بہار کو ہر سو سے حُسن آمیز کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہزاروں مور اور چکور اپنی آوازوں سے اسے پُر رونق کر رہے ہیں۔ عشق میں گھائل خون رنگ گل لالہ ہے اس میں انار، رس بھرے انگور ہیں۔ طوطے ان سے مطلوب ہیں قمریاں گوک پکار کر رہی ہیں۔ ہاشم چمن کا یہ منظر دیکھ کر روح مسرور ہے۔ (۱۲)

پنجابی داستانوں میں باغوں اور باغیچوں کی ایسی منظر نگاری بکثرت ملتی ہے جو ان کرداروں کی

حرکات و سکناات، اعمال و افعال کے ساتھ ساتھ شاعر کی باطنی و داخلی کیفیات کی بھی ترجمان ہوتی ہیں مثلاً
میاں محمد بخش نے داستان سیف الملوک میں تصوف کے رموز و مدارج کے ساتھ ساتھ ذات احد و حق کی صفت
وثنائی کے لیے گلشن و باغات کا ذکر کمال خوبی سے کر کے حمدیہ شاعری میں نیا اسلوب متعارف کرایا:

کام تمام میسر ہوندے نام اوہدا چیت دھریاں
رجوں سیکے ساوے کردا قہروں ساڑے ہریاں
قدرت تھیں جس باغ بنائے جگ سنسار تمامی
رنگ برنگے بوٹے لائے کچھ خاص کچھ عامی
کہناں دے پھل بیٹھے کیتے پت اوٹھاں دے کوڑے
کہناں دے پھل کاری آنون نغے پھلاں دے تھوڑے
ایس عجائب باگے اندر آدم دا رکھ لایا
معرفت دا میوا دے کے واہوا پھل دار بنایا
رحمت دا جد پانی لگا تاں ہو یا ایہ ہریا
ہر ہر ڈالی نے پھل پایا سر دھرتی جد دھریا

یعنی تمام کام اُس ذات کو دھیان میں رکھ کر آسان ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے رحم سے سُوکھے
ہوئے ہرے کرتا ہے اور قہر سے ہروں کو جلا دیتا ہے۔ وہ جس نے اپنی قدرت کا ملہ سے تمام جگ بنائے۔ اس
باغ میں خاص و عام بنائے۔ ایک وہ جو جن کے پھل بیٹھے، پتے کڑوے ہیں اور ایک وہ جن کے پھول کا رآمد
ہیں جبکہ پھلوں کے فوائد کم ہیں۔ اس عجیب باغ میں رب نے آدم کا درخت لگایا۔ معرفت کا پھل دے کر اسے
خاص بنایا جو اُس کی رحمت کے پانی سے ہرا ہوتا ہے اور جب انسان سجدہ ریز ہوتا ہے تو اُس کی ڈالی میں پھل
لگنے لگتے ہیں۔ (۱۳)

اسی طرح جب ہم مولوی غلام رسول عالمپوری کی مثنوی 'حسن القصص' کی طرف آتے ہیں تو وہاں
ہمیں زلیخا کے باغات میں اُگے پھلوں، میوؤں اور ایسے مصالحوں کا ذکر ملتا ہے جو مرض محبت میں مبتلا مریضوں
کے لیے باعث شفا ہیں۔ زلیخا عشقِ یوسف میں بیمار ہے تو حکما اُن کی بیماری کا علاج اُس کے باغ میں اُگے
درختوں کے پھلوں اور اُن پھلوں کے مغزوں میں پوشیدہ بتاتے ہیں۔ یوں تو کئی دیگر علوم بھی اس داستان کا
حصہ ہیں لیکن یہاں صرف علمِ شجر و نبات کی ایک مثال پیش کی جا رہی ہے جس سے مولوی صاحب اپنے علم،
فضل و ہنر میں ماہر نباتات ہی نہیں، ماہر طبیب بھی معلوم ہوتے ہیں:

میوہ دار درختاں باگے خوان دھرے یغمائی
باد بہار پکھیر و آں بھکھیاں ایہ خوشخبری سُنائی

نارنجوں لے رسا جوانی ٹھنڈ پوے وچ سینے
 چکھ انجیر رہے وچ لب دے لذت چار مہینے
 کھاندیاں دے جان دماں وچ ضعت قواؤں سارے
 درم طحال ہزال الکلیہ سینے دے دُکھ بارے
 گچھے داکھ لکدے اُچے جیوں کرسی پرویناں
 تے وچ باغ قرفل یوٹے لٹے ماہ جیناں
 کتے نرنج کتھائیں بنو سرد دوائی سوکھالی
 گلگل کیتے لکدی شاخیں پلھ گواون والی
 فستق لوز دوویں وچ جوزاں کشمش پھڑے کنارے
 خشک دماغاں نوں ہر شاخوں بھک بھک کرن اشارے (۱۴)

پنجابی میں درختوں کے لیے رُکھ، ہرکھ، برچھ، درچھ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اُن کا اور یہاں کی متھالوجی کا بھی گہرا تعلق ہے۔ مثلاً: مرزا صاحبان کا درخت کے ساتھ موت و وصال کا تعلق رہا کہ وہی آخری آماجگاہ وہی جائے وصال بنا، نیز وہی درخت اُس کی اور مرزے کی موت اور ان کے اس لمحے کا گواہ تھا۔ اسی طرح برگد، پیپل، شربہ، ٹاہلی، نیم، آم اور کیکر کے درختوں کا یہاں کی مقامی رہتل کا گہرا ناظر آتا ہے۔ پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے اس تعلق کو دیکھیں تو دریاؤں، کھیتوں، کھلیانوں، باروں، بیلوں، جنگلوں کے جغرافیائی خدوخال اس کے لوک ادب سے لے کر ابتدائی مذہبی شاعری میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔ لوک شاعری میں سے کچھ مثالیں:

ساڈا دلیں سہاگن سارا
 چپے چپے کھوہ وگدے
 یعنی ہمارا پورا دلیں سہاگن جیسا ہے یعنی بھرپور، زرخیز جس میں جگہ جگہ کنوئیں ہیں جو زمین سیراب کرتے ہیں۔

ٹھنڈی چھاں ہووے الیں رُکھ دی
 کتھے وے ماہی میرا، میں پکھوآں توں راہ پکھدی
 یعنی اس درخت کی چھاؤں گھنی اور ٹھنڈی ہو۔ اس پر بیٹھنے والے پرندوں سے میں اپنے محبوب کا پتہ پوچھتی ہوں۔

نی لے دے مائے کالے باگاں دی مہندی
 گلی گلی میں پتر چنیدی، لوکی کھندے مستانی

یعنی اے میری ماں مجھے کالے سبز باغوں سے مہندی لے کر رنگ دے۔ میں گلی گلی پتے چٹتی ہوں
تو لوگ مجھے جھلی مستانی کہتے ہیں۔

پھل نیویاں رُکھاں نوں لگدے
شملے دا مان نہ کریں
یعنی پھل کم اونچے درختوں پہ لگتا ہے، اس لیے پگڑی کے اونچے شملے پر گھمنڈ نہ کرنا۔

مانواں ٹھنڈیاں چھانواں
میں سو سو رُکھ پئی لاواں
یعنی مائیں ٹھنڈی چھائیں ہوتی ہیں، میں مامتا کے سو سو درخت لگا رہی ہوں۔

یوں کلاسیکی اور لوک پنجابی ریت میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے ہاں درختوں، پھولوں،
بوٹوں، کھیتوں کھلیانوں اور جڑی بوٹیوں کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے موجود نہ ہو۔ پھر ادب کو علوم و فنون کے
ساتھ پرکھنے جانچنے کا سائنسی طریقہ اپنایا گیا اور بات ادب کے عمرانی مطالعے (Sociological
Study) سے ماحولیاتی پرکھ (Eco-Criticism) تک پہنچی تو درخت ایک استعاراتی اور علامتی حیثیت
اختیار کر گیا اور اس کی یہ حیثیت نئی نہیں ہے کہ درخت کا انسان اور خالق گل کے ساتھ ربط و حجاب قدیمی بھی
ہے، دائمی بھی گو یہاں ایمان و عقائد کی گفتگو نہیں بلکہ صرف اشجار کی ماحول اور معاشرے میں اہمیت اور
عہد جدید میں اس کے حوالے سے سماجی شعور و آگہی ہے کہ جہاں جہاں یہ شعور پختہ ہوتا گیا وہاں انسان
درختوں سے ہم کلام ہوتے رہے اور درخت انسان کے دوست بنتے گئے۔ کلاسیکی پنجابی ادبیات میں اس کی
مختصری تصویر کشی یا ایک جھلک کے بعد جب ہم جدید ادب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ماحولیاتی آگہی کے ساتھ
ساتھ دوست درخت، ہمراہی درخت اور شجر مسیحا و پناہ گاہ جیسے تصورات کے ساتھ بھی موجود نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ پنجاب کی قدیم تہذیب میں درختوں سے توہمات کی
بے شمار کہانیاں بھی موجود ہیں۔ نیک و بد شگون بلیں بوٹے، درختوں کی ٹہنیوں کے ساتھ منتوں کے دھاگے اور
کپڑے کی باریک کترنیں اُن کی پورتی تک کے لیے باندھی جاتیں نیز درختوں کے ساتھ عقیدت اور تعلق کی
بھی کئی مثالیں پنجابی ادبیات کا حصہ ہیں، مثال کے طور پر نجم حسین سید کی نظم ”گلر“ دیکھیے جس کے بوٹے کو
اُن کی ماں بھوٹے ہی نکلوادیتی تھی لیکن زمین میں کئی پودوں کے تنے نہیں، جڑیں سفر کرتی ہیں پھر جہاں انھیں
اُبھرنے کا موقع ملے وہیں سے آغاز کرتی ہیں یوں انھوں نے گلر کی تمثالی کہانی کے ذریعے یہ سمجھایا کہ بوٹے
اور درخت منحوس نہیں ہوتے، اُن کا جو کام نظام قدرت میں متعین کردہ ہے وہ تو وہی انجام دیتے ہیں ہم ہی
اپنے عقائد میں تو ہم کی آمیزش سے عقیدت اور خوف کو کئی اشکال دیتے ہیں اور فطرت اپنا فرض انجام دیتی رہتی ہے:

ویٹھے ساڈے وچ ہاؤ ٹاگرے نا
ذرا جہا سر کڈھے اوہ تے ماؤ مھاڑی کپوا چھوڑے
اکھ گھر جتھے ہووے ورا نی کرنا / ٹنڈرہ جُلنا
رُت اشنی تے پُھٹ پینا / چالیہ ور ہے پچھی گُڑ
ماؤ مری!

میں اڈیاں پُھٹے تے کپاں ماؤنی ریتی / رُت لنگھی اوہ پُھٹیا کوئی نہ
اسیں حیران تھئے / گل و سَری

ٹنڈوی سَرو سَک مٹی رلیا / ہک دن باہر لی کندھ تلے میں تکاں سڑکے آلے پاسے
گُڑے نے دووٹے / سمجھ رلی تے اتنی
وِرا نی کرے نہ کرے / گُڑ حیرانی کرناے

یعنی ہمارے صحن میں گُڑ کا ایک پودا تھا جب ذرا سی کوئلیں نکلیں تو ہماری ماں اسے ترشوا دیتیں اور
کہتیں کہ گُڑ کا پودا جہاں ہو، وہاں ویرانی آ جاتی ہے اور اُس کے پتے اُتر وادیتیں اور صرف اُس کا تنارہ جاتا۔
جب موسم بدلتا تو وہ پھر ہری ہونے لگتی۔ چالیس برس میں اپنی ماں کو ایسے ہی کرتا دیکھتا رہا۔ ماں کی دائمی
مفارقت کے بعد میں انتظار کرنے لگا کہ گُڑ پھوٹے تو میں اپنی ماں کی ریت بھاؤں۔ لیکن موسم بدلنے پر بھی
اس بار وہ پھوٹی نہیں، ہم بات بھول گئے۔ لیکن ایک دن میں بیرونی دیوار کے پاس سڑک کے ارد گرد دیکھ رہا تھا
تو گُڑ کے دو پودے نکلے ہوئے تھے، جنہیں دیکھ کر مجھے سمجھ آئی کہ گُڑے کا پودا ویرانی کرے چاہے نہ، حیرانی
ضرور کرتا ہے۔ (۱۵)

اشجار و نباتات فطری ماحول کا بنیادی جزو ہیں کہ صاف آب و ہوا اور صحت مند فضا اسی سے ممکن
و مشروط ہے اور انسان، چرند پرند، حیوانات غرضیکہ ہر سانس لیتی مخلوق کے نظام تنفس و بحالی صحت کے لیے ان کا
ہونا پانی اور ہوا کی طرح ہی ضروری ہے۔

امرتا پریتم اپنی ایک نظم ”ورش گنڈ“، یعنی برسات کے پانی سے بھرا ہوا تالاب، میں درختوں کی
متھاس کے ذریعے عشق کے آداب و کیفیات کو خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں وہ وسیب کے ساتھ ماحولیاتی شعور
و آگہی بیدار کرتی بھی نظر آتی ہیں۔

ورش گنڈ: (برسات کے پانی سے بھرا ہوا تالاب)

اوہ ورش گنڈ کتھے ہے؟ اوس واواں نوں پچھیا، تے واواں نے کہیا
اتھے ہی کتھے ہوندا سی تھیہہ جیہا دسدا سی
کوئی جیو جنتو وی پستیاں راہواں تے نہیں آوندے تے ور ہے پچھوں تھیہہ وی سنجاتے نہیں جاندے

پھیر گجھ رُکھاں دی ہری چھاویں اوہ رتھ وچوں اُتریا
 رُکھاں دے پیر چھو ہے تاں رُکھاں نے جڑھاں تیکر اک ہوکا لیا
 کہن لگے آجیویں بس تیرا مونہہ تگنا سی سو راہواں تے کھلوتے ہاں
 نہیں تاں کسمیہ پتہ ہوندا تے کہاڑیاں دی رُتے
 ساہواں دا وساہ نہیں پیندا

یعنی وہ برسات کے پانی سے بھرا ہوا تالاب کہاں ہے؟ اس نے ہواؤں سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہیں کہیں ہوتا تھا نشان بتاتے ہیں۔ کوئی بھی نچلی راہوں کا مسافر نہیں ہوتا اور سال بعد جگہیں بھی پہچانی نہیں جاتیں، پھر کچھ ہرے درختوں کی چھاؤں میں (دوبیلوں والی اُس کی گاڑی) رتھ اُترا۔ درختوں کے پیر چھوئے، تو درختوں نے اپنی جڑوں تک آہ بھری اور بولے کہ بس جیسے صرف تمھاری صورت ہی تگنا تھی، سو راہوں میں کھڑے ہیں۔ نہیں تو کیا معلوم ہوتا ہے ہونے کا کیونکہ کلباڑیوں کے موسم سانس بے یقین ہوتی ہیں۔ (۱۶)
 جدید پنجابی نظم میں 'درخت' بطور استعارہ، اشارہ، کنایہ اور علامت کے طور پر غرض کئی طرز سے استعمال کیا گیا ہے۔ سبزے اور درختوں کی کمیابی کے باعث ماحولیاتی آلودگی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ جہاں سماجی ماحول کو متاثر کرتی ہے وہیں یہ عصری سماجی صورتحال کی تصویر کشی بھی خوب کرتی ہے۔ صابر علی صابر اور ریاض کھوکھر کی دو نظمیں سماجی ماحولیاتی آلودگی کی طرف واضح اور مبہم اشارے بھی ہیں اور سماجی طنز بھی:
 چھانگے رُکھ سی چھاں کیہ دیندے اس موسم نوں ناں کیہ دیندے
 ویڑھے وچ بندوقاں ٹنگیاں پیار سُنہیے کاں کیہ دیندے
 یعنی ترشے گئے درخت کیا چھاؤں دیتے، اور ان موسموں کو کیا نام دیتے، صحن میں بندوقیں لگی ہوں تو کوئے محبت کے پیام بر کیسے ہوں؟ (۱۷)

گولڈن جوبلی

گجھ ایانے بوڑھ پیٹھاں بیٹھے کرن حساب
 جیہڑی پیلی وچ سن بیجے وڈیاں پھل گلاب
 پھلاں دی تھان او تھے اُگے کئی کنڈیالے رُکھ
 چڑیاں بھلکھم بھانیاں، تے سوراں بھر لئی کُکھ
 یعنی کچھ بچے برگد کے نیچے بیٹھ کر جانچ پڑتال کر رہے تھے کہ جس کھیت میں ہمارے بزرگوں نے گلاب کے بیج بوئے تھے وہاں کانٹوں بھرے درخت کیسے اُگ آئے، جہاں چڑیاں بھوکی ہیں اور انھوں نے نوکیلے کانٹوں سے اپنی کوئیں بھر لی ہیں۔ (۱۸)

جدید پنجابی ادب میں 'درخت' کو بطور سماجی استعارہ سب سے زیادہ استعمال کیا گیا۔ پنجاب کے

سماجی جیون میں جہاں سانجھ اور جُوت اس کے ڈھانچے کے بنیادی ستون ہیں جب کہ اس نظم میں تنہائی، اکلاپا، ہجرت، عدم توجہی کو شاعر نے ایک طرف تنہا درخت کے نوے کی صورت میں پیش کیا ہے اور اپنے احساسِ محرومی کو زبان دی ہے اور دوسری طرف درختوں کے احساسِ تنہائی اور اکلاپے کو ایک طنزیہ بیانیہ سے سمجھایا کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ہمسری و ہمسائیگی جیسی گروہی زندگی جینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اُن میں بھی Mutal relationship ہوتا ہے۔ نہ ہو تو وہ کیسے احساس میں مقید ہو جاتے ہیں اس نظم میں دیکھیے:

کَلے رُکھ داؤین

کدھر رُ گئے مالی جیناں رت مُڑکا اک کر کے
مینوں چھاواں نال سجایا اک سوہنا رُکھ بنایا
کال پیا تے رات ہنیری کھاگئی میری ساوے پتر
پی گئی میرا خُون اکھاں تک تک انھیاں ہونیاں
کدھرے نہ کوئی پنچھی دسیا کدھرے نہ پیار دا گاؤن، میں اک پنجر
میرے کول لُدی پھرے ہوا

تنہا درخت کی پُکار

وہ مالی کہاں گئے جنھوں نے مجھے خون پانی ایک کر کے، ایک درخت بنایا تھا۔ قحط پڑا تو کالی اندھیری رات میرے ہرے پتے کھاگئی اور میرا خُون پی گئی۔ آنکھیں یہ سب دیکھ کر بے رُو رہو گئیں۔ کہیں کوئی پرندہ نظر نہیں آیا کوئی گیت سُنانی نہیں دیا۔ میں ایک ڈھانچہ ہوں اور ہوا مجھ سے چھپتی پھرتی ہے۔ (۱۹)

جدید پاکستانی پنجابی شاعری کے بانی شریف کنگا ہی کی نظم ”ون داؤنا“ اور پوٹھوہاری لہجے کے نمائندہ شاعر باقی صدیقی کی ”ہک بوٹا“، درخت اور مسافر کے بیانیے میں زندگی اور انسان کی کہانی ہے۔ گویا سادہ مفہوم میں انسان کو زندگی کی ناپائیداری اور مسلسل سفر میں موقوفیت کا تصور سمجھایا گیا ہے۔

ہک بوٹا

ہک بوٹا گھل مگھلا سڑنے بکنے راہیاں کی
پتراں نی پکھئی جھولے کتنے چڑے، کتنے صافے
ہاڑے جیٹھے نی دھپاں وچ دُنیا نی نظراں توں اوہلے
اس بوٹے چھاویں بہہ کے دلاں نی بولی بولے
آن مسافر، جان مسافر ایہ پتراں نی وٹھاں وچوں
ہر راہی آں ہٹ ہٹ تکے کوئی اس نا راز نہ سمجھے
کوئی نہ دل پھرو لے

یعنی ایک درخت جو شدید دھوپ میں آتے جاتے مسافروں کو اپنے پتوں سے ہوا دیتا ہے۔ ہاڑ،

جیٹھ کی تپتی دھوپ میں لوگوں کی نظروں سے دور لوگوں کے لیے کھڑا ہے جہاں کچھ مسافر آتے ہیں اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر دل کی باتیں کرتے ہیں اور یہ درخت پتوں کی اوٹ سے ان مسافروں کو غور سے دیکھتا ہے۔ کوئی اس کا راز نہیں جانتا اور کوئی اس سے پوچھتا بھی نہیں۔ (۲۰)

درخت کی تنہائی اور اکلاپے کے جس درد کا اظہار پنجابی نظم میں ہے، ویسا ہی احساس غزل میں بھی بھر پور ملتا ہے۔ مثلاً یونس احقر درختوں کے اکلاپے کو، ہی ان کی کمیابی اور ویرانی کا یہ احساس پرندوں کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں:

سُکی ساوی کوئی وی ٹہنی پیر ٹکان نوں ملدی نہیں
آہلیاں لئی چُجھاں دے وچ تیلے چائی پھرنے آں (۲۱)

یعنی ہری تو کیا اب تو سُکھی ہوئی بھی کوئی ٹہنی نہیں ملتی جس پر ہم اپنا گھونسلاتو کیا بنانا بچہ بھی ٹکاسیں کہ ہم تو اپنی چونچوں میں تنکے لیے اڑتے پھرتے ہیں۔

ایس چمن وچ رُت بہار نوں سَدن لئی
ہر کندے تے قتلی ٹنگنی پیندی اے (۲۲)

اس شعر میں شاعر نے بے حسی و بے کیفی کو موضوعِ سخن کر کے قارئین میں ایک چمکتی بھبتی بھی کسی ہے کہ باغ میں بہار کے موسم کو ملانے کے لیے ہر ایک خار پر قتلی کو خود کو قربان کرنا پڑتا ہے یوں باغ کی رونق تیلیوں کے مصلوب ہونے سے مشروط ہے۔ یعنی فطرت کی آباد کاری کے لیے رگوں اور سانسوں کی تیز کاری لازم ٹھہری ہے۔

کیہڑا بھُل کھڑان دے اپنے جتن کرے
گلے تے خشبو چھڑکا کے بہ گئے آں (۲۳)

طرہ یہ کہ ہم مصنوعیت اور عارضیت کے گہر میں اس قدر ٹھہر گئے ہیں کہ قدرت کے فطری حسن و خشبو کے احساس سے عاری ہو گئے ہیں اس مبینہ دور اور ٹیکنالوجی کی یلغار یا کرامات کہیے کہ اب اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، اب مصنوعی پھولوں پر کیمیائی مادوں سے بنی خوشبو میں احساسِ لطافت کی تسکین کرنے لگی ہیں۔

یہ امر انتہائی دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی کہ دُنیا کے بیشتر ادیان و اعتقادات میں اشجارِ مقدس و ممنوع کا ذکر موجود ہے جو خالق کائنات کے وجودِ عاقلانہ اور حکمِ یزداں سے منسوب ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ انسان اور خُدا کے کلام کے پہلے سامع یہ اشجار ہی تھے جو اُن کے ہمراز ہوئے اور آج تک یہ اُسی عہدِ دلبری کو نبھاتے چلے آ رہے ہیں۔

بس اس کرے کے باسی اس یار پارینہ کی قدر کرنا بھول گئے اور کائنات کے فطری حُسن کی اولین

علامت اشجار و نباتات کے رنگ اور رابطے ابن آدم سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں حالاں کہ ہر ذی روح کے لیے یہ ناگزیر تھے کہ جیون ربط اسی سے ماخوذ تھا۔

درختوں کے اکلا پے کی کیفیت و احساس کا ذکر تو درج بالا سطور میں آچکا، ہمارے ہاں کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں درخت بھی دوستوں اور ہمسایوں کی طرح اپنے داخلی احساسات و جذبات ایک دوسرے سے بانٹتے ہیں۔ سر جیت پاتر جدید پنجابی نظم کا ایک نمایاں حوالہ ہیں۔ اُن کی نظم ”دور کھاں دی گفتگو“ Symbiotic Relationship میں کس کس انداز میں انسانی جذبات میں ایک عجب ہلچل و ہیجان برپا کرتا ہے کیونکہ اس کا انداز کاٹ دار بھی ہے اور کانٹے دار بھی، انسانی سوچ کے مثبت و منفی دائروں میں گھومتے یہ مکالمے قاری میں مزاحمت اور آگہی جیسے رموزی تار چھیڑ جاتے ہیں۔

دور کھاں دی گفتگو

میری	سُولی	بناؤ	گے	کہ	رُباب،	جناب
کہ	میں	ایوں	ہی	کھڑوتا	رہاں	ساری عمر
موسماں	دا	حساب	کتاب،	جناب	کوئی	جواب؟؟!!
مینوں	کیہ	پتہ.....	مینوں	کیہ	پتہ	میں تاں، آپ ہاں تیرے وانگ اک درخت
توں	ایوں	کر	اخبار	دا	دیکھ	اخبار
اخبار	وچ	گجھ	نہیں	جھڑے	ہوئے	پتے
فیر	کوئی	کتاب	دیکھ	کتاب	وچ	بیچ
سوچ	وچ	ٹک	نیں	دنداں	دے	نشان
راہیاں	دی	پیڑ	ہے	جاں	میریاں	نہوندریں
جیڑیاں	میں	بچپن	لئی	دھرتی	دی	بک
سوچ	وی	قید	ہے	سوچ	وچ	خوف
لگدا	ہے	دھرتی	دے	نال	بجھا	ہویا
ٹٹ	کے	کیہ	ہوئے	گا؟	رکھ	نہیں
راکھ	نہیں	تاں	ریت	سہی	ریت	نہیں
چنگا	فیر	چُپ	کر	میں	کدوں	بولداں؟

ایہ تاں میرے پتے نہیں ہوا وچ ڈولدے

یعنی جناب آپ میری سُولی بنائیں گے یا رباب یا میں یونہی ساری عمر پتوں کو لیے کھڑا رہوں گا، موسموں کا حساب کتاب لیے؟ دوسرا درخت جواب میں کہتا ہے میں تجھے تیرے سوالوں کا کیا جواب دوں میں

تو خود ایک درخت ہوں تم اخبار دیکھ لو۔ وہ آگے سے کہتا ہے، اخبار میں کچھ نہیں گرے ہوئے پتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے پھر کوئی کتاب دیکھو۔ وہ جواباً کہتا ہے کہ کتاب میں بیج ہیں تو وہ کہتا ہے پھر سوچ دیکھو۔ وہ جواب دیتا ہے کہ سوچ میں سوراخ ہیں دانتوں کے نشان ہیں سانسوں کی بازگشت ہے یا میرے نوکیلے ناخن جو میں نے بچپن میں زمین کے سینے میں چھوئے تھے پھر وہ کہتا ہے، سوچو، سوچو مزید سوچو۔ پھر وہ کہتا ہے سوچ بھی مقید ہے اُس میں خوف ہے، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں زمین کے ساتھ جکڑا ہوا ہوں۔ دوسرا کہتا ہے جاؤ! پھر ٹوٹ جاؤ! ٹوٹ کر کیا ہوگا؟ پہلا پوچھتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے درخت نہ رہا تو راکھ سہی، راکھ نہیں تو ریت سہی، ریت نہیں تو بھاپ سہی۔ دوسرا کہتا ہے چلو اب چپ کرو۔ پہلا جواب دیتا ہے میں کب بولتا ہوں یہ تو میرے پتے ہیں جو ہوا میں لہلہاتے ہیں۔ (۲۴)

اس نظم میں شاعر نے نباتات کی فطری تولید کاری (Natural Dilution Process) کے نظام کے ذریعے سے فکری شعور کی آبیاری کی ہے اور اس کے اصل اجزائے ترکیبی کو ایک تمثیل کے ذریعے بیان کرنے کی سعی کی ہے۔

بارش کے پانی یا مٹی کی نمی سے ہی اُگ آنے والی جڑی بوٹیاں اور گھاس پھوس اگر بے آب و گیاہ میں ہوں تو جنگل و بیلوں کا حصہ ہوتی ہیں جو اگر ترتیب سے اُگائی جائیں تو باغیچے کا حصہ ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ خود روئو کیلا گھاس اپنی زمین پر بم اور بارود کی کھیتیوں کے اُگنے کے خلاف ایک مزاحمتی علامتی اظہار بھی بن جایا کرتا ہے۔ پاش بیسویں صدی کا وہ شاعر ہے جو ظلم، جبر، بربریت کے خلاف سینہ سپر ہے وہ طبقاتی عدم توازن کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتوں کے تیسری دنیا کے انسانوں پر زمین تنگ کرنے کے حربوں اور اُنھیں مختلف دھڑوں اور حصوں کی سیاست کا ایندھن بنانے والی سبھی باطل سوچوں سے آگے رکھتا ہے۔ وہ بظاہر بے ضرر و بے وقعت و کم مایہ نباتات سے خود کو منسلک کرتا ہے لیکن اپنے انداز بے باکانہ سے یوں گویا ہوتا ہے کہ ظالم کے خلاف بلند آواز اُٹھاتا ہے اور مظلوم کا حوصلہ بنتے ہوئے ظالم کے خلاف اُٹھنے کی ترغیب دیتا ہے یوں یہ لفظی و معنوی ہر دو حوالوں سے ایک نیا انداز بیان ہے:

میں گھاہ ہاں گھاہ میں تہاڑے ہر کیچے کرائے تے اُگ آواں گا
بمب سٹ دیو بھاویں وشو وِ دیا لے تے
بنا دیو ہر ہاٹل بلے دے ڈھیر
سُہا گہ پھیر دیو بیشک ساڈیاں جھکیاں تے مینوں کیہ کرو گے؟
میں تے گھاہ ہاں، ہر چیز ڈھک لواں گا
میں گھاہ ہاں، میں اپنا کم کراں گا
میں تہاڑے ہر کیچے کرائے تے اُگ آواں گا

یعنی میں گھاس ہوں، میں تمھارے تیار کیے گئے ہر میدان میں اُگ آؤں گا۔ تم چاہے تعلیمی اداروں پر بمباری کر کے ڈھیر کر دو یا ہاسٹلوں کو گرا دو، غرض کہ چاہے ہر ایک شے کا صفایا کر دو یا ہمارے خیمے برباد کرو۔ میں پھر بھی اُبھر آؤں گا کہ میں گھاس ہوں، میں اپنا کام دکھاؤں گا اور تمھارے کیے کرائے پر نمودار ہو کر دکھاؤں گا۔ (۲۵)

اشجار کی انسانی رشتوں ناطوں غرضیکہ خاندانی ڈھانچے کے اٹوٹ تعلق کی جذباتی انداز میں تصویر کشی اس بات کی غماز ہے کہ درختوں کا وجود انسانوں کی نفسیاتی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ درخت، جنگ، رات اور ویران رستے کی ڈراتی فضاؤں کو پاش اور منیر نیازی نے اپنی شاعری میں خوف اور جرات کے استعاروں میں کمال ہنر سے بیان کیا ہے یہی احساس جب مظہر ترمذی کے ہاں نرگسیت کے انداز میں اُبھرتا ہے تو پر دیسی مظہر ترمذی جب اپنے وطن لوٹتا ہے تو درختوں سے یوں ہم کلام ہوتا ہے:

خش و سدا اے مُلک بگانہ
سانوں ساڈی رُت نہ بھلی
بیلے، ساوی، گھاء تے چڑیاں
ککراں دے پھل ٹاہلیاں
کتھے جے کتھے عمراں گالیاں

یعنی بیگانہ ملک شاد و آباد ہے، ہمیں ہمارے موسم نہیں بھولتے۔ بیلے، ہری گھاس اور چڑیاں، کیکر کے پھول اور شیشم۔ ہم کہاں پیدا ہوئے اور کہاں عمریں گزار دیں۔ (۲۶)

بیسویں صدی میں جدید تر لہجے کا کلاسیک شاعر شوکار بٹالوی ہے جو تہذیب و ثقافت کا رموز داں بھی ہے اور مظاہر قدرت سے شناسا بھی، اور وہ بھی ایسے کہ قاری پہ اُس کا کلام سحر کرتا جاتا ہے۔ مثلاً اُس کی یہ نظم دیکھیے:

گجھ رُکھ مینوں پُت لگدے نیں	گجھ رُکھ لگدے ماواں
گجھ رُکھ نونہاں دھیاں لگدے	گجھ رُکھ وانگ بھراواں
گجھ رُکھ میرے بابے واکن	گجھ رُکھ پتر ٹاواں
گجھ رُکھ میری دادی ورگے	گجھ رُکھ پاوان کاواں
گجھ رُکھ یاراں ورگے لگدے	گجھ رُکھ تے گل لاواں
اک میری محبوبہ واکن	مٹھا اتے دکھاواں
گجھ رُکھ میرا دل کردا اے	موڈھے چک کھڈاواں
گجھ رُکھ میرا دل کردا اے	چٹاں تے مر جاواں

گجھ رُکھ جد وی رل کے تھومن تیز وگن جد واہواں
 ساوی بولی سبھ رُکھاں دی دل کردا لکھ جاواں
 میرا وی ایہ دل کردا اے رُکھ دی جُونے آواں
 جے تئیں میرا گیت ہے سُننا میں رُکھاں وچ گاواں
 رُکھ تاں میری ماں ورگے نیں جیہون رُکھاں دیاں چھاواں

یعنی کچھ درخت مجھے پیٹے لگتے ہیں اور کچھ درخت ماؤں جیسے، کچھ بہوؤں بیٹیوں جیسے اور کچھ بھائیوں جیسے۔ کچھ رُکھ میرے بزرگوں جیسے، جن پر کوئی کوئی برگ ہے، کچھ درخت میری دادی جیسے جو کوؤں کو چوری ڈالتے ہیں۔ کچھ درخت جگری دوستوں جیسے، جنہیں چومتا اور گلے لگاتا ہوں۔ ان میں ایک میری محبوبہ کے جیسا ہے مٹھا بھی اور غم گیر بھی۔ کچھ درخت ایسے ہیں جنہیں میرا جی چاہتا ہے، کندھے لگا کر کھلاؤں اور کچھ درخت ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ انہیں چوموں اور مر جاؤں، کچھ درخت جب مل کر جھومتے ہیں تیز ہوائیں جب چلتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان درختوں کی ہری بولی لکھ ڈالوں، میرا یہ جی چاہتا ہے کہ اب میں درخت کا جنم لوں کہ اگر تم میرا گیت سُننا چاہتے ہو تو میں درختوں میں سے سُناؤں کہ یہ درخت تو میری ماں جیسے ہیں، اللہ کرے ان کی چھاؤں سدا سلامت رہے۔ (۲۷)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اشعار و نباتات کا زندگی سے منسلک شاید ہی کوئی ایسا حوالہ ہو جو پنجابی ادبیات میں نہ ملتا ہو۔ دراصل مقامی جغرافیہ، تہذیب، ثقافت، رسم و رواج اور سب سے بڑھ کر وہ مٹی، جہاں انسان آنکھ کھولتا ہے، شعور پاتا ہے، فکر کو پرواز دیتا ہے، وہ اُس کے لاشعور و تحت الشعور میں اُن خزانوں کی مانند ہوتی ہے جو انسان کو فہم و فراست اور ذہنی آسودگی مہیا کرتی ہے جس سے وہ سماج میں ایک نیا شعور، نئی آگہی دینے میں مدد لیتا ہے کہ نئے علوم کا شاخسانہ خیال سے پھوٹتا ہے۔ زمین اور صاف ماحول اس کی پاکیزگی اور پرواز کے لیے سازگار ہونے چاہئیں، ایجاد، اختراع اور فکری آسودگی اسی سے منسلک ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

- (۱) ظہور احمد ظہر، ڈاکٹر۔ معارف فریدیہ: تعارف و ترجمہ دیوان بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (لاہور: مرکز معارف اولیاء دربار حضرت داتا گنج بخش، محلہ مذہبی امور و اوقاف، حکومت پنجاب ۲۰۰۵ء) ص ۱۴۳
- (۲) آصف خاں، محمد۔ آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹ء) ص ۳۱۴
- (۳) آصف خاں، محمد۔ آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹ء) ص ۱۸۰-۱۸۱
- (۴) ایضاً، ص ۹۴
- (۵) ایضاً، ص ۹۷

- (۶) کلام نائک - جیت سنگھ سیتل (امریکہ: اپنا سپرنگ فیلڈ 22153 VA، ۲۰۰۱ء) ص ۲۲۱
- (۷) حمید اللہ ہاشمی - مینڈا عشق وی توں شرح کلام خواجہ غلام فرید (لاہور: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۱ء) ص ۳۵۴
- (۸) نور احمد خاں، ڈاکٹر - دیوان فرید (جلد دوم) (ملتان: قصر الادب) ص ۲۳۷۔
- (۹) نبیلہ رحمن، ڈاکٹر - فقیر قادر بخش بیدل: رمز وجود و نجاون دی (لاہور: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لٹریچر آرٹ اینڈ کلچر، ۲۰۱۰ء) ص ۶۷
- (۱۰) نذیر احمد، سید - کلام بلھے شاہ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء) ص ۴۰
- (۱۱) شیخ عبدالعزیز باریٹ لاء - بہیر سبید وارث شاہ (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب اردو بازار، ۲۰۰۱ء) ص ۱۰۲
- (۱۲) حمید اللہ ہاشمی - سسی ہاشم شاہ (لاہور: مکتبہ دانیال) ص ۱۳۵۔
- (۱۳) ایضاً، ص ۳
- (۱۴) مولوی غلام رسول عالمپوری - احسن القصص (لاہور: پنجابی ادبی اکادمی، سن ۱۸۵-۱۸۶)۔
- (۱۵) نجم حسین سید - اکنان ناہیں لون (لاہور: رُت لیکھا، ۲۰۰۵ء) ص ۱۰-۱۱
- (۱۶) امرتا پریتم - کاغذ تے کینوس (لاہور: سانجھ پبلشرز، ۲۰۰۶ء) ص ۵۲۳
- (۱۷) صابر علی صابر - الف دا پاندھی (لاہور: سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۲ء) ص ۳۳
- (۱۸) ریاض کھوکھر - پکھو (لاہور: ایس اینڈ کے کیونیکیشن، ۲۰۰۸ء) ص ۱۲۰
- (۱۹) ایزد عزیز - کلمے رکھ دا وین (ساہیوال: پنجاب لوک لہر، ۲۰۰۹ء) ص ۱۶
- (۲۰) باقی صدیقی - کچے گھڑے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۴ء) ص ۱۷-۱۸
- (۲۱) یونس احقر، ڈاکٹر - دکھ اُڈاری لگے (لاہور: پنجابی فاؤنڈیشن، ۲۰۰۹ء) ص ۶۲
- (۲۲) ایضاً، ص ۴۶
- (۲۳) زاہد نواز - پارے گھنے مٹی (لاہور: مسعود کھدر پوش ٹرسٹ، ۲۰۰۶ء) ص ۱۴۰
- (۲۴) سُر جیت پاتر - دھکھدا جنگل (نارتھ امریکہ: اکیڈمی آف پنجاب، ۱۹۸۸ء) ص ۶۷-۶۸
- (۲۵) پاش - ساری شاعری (لاہور: جیت کتب گھر، ۲۰۰۵ء) ص ۲۸
- (۲۶) کایا گلد - مظہر ترمذی (لاہور: ادم پبلشرز، ۱۹۹۸ء) ص ۸۹
- (۲۷) شوروکار: سیپورن کا وسنگریہ (لدھیانہ: لاہور بک شاپ 2 - لاجپت رائے مارکیٹ، ۲۰۱۲ء) ص ۶۹۱

